○ ...۱۸۵۶ء

(پیر) بوڑھا اور (بَرنا) ہے جواں   جان کو البتہ کہتے ہیں (رواں)

اینٹ کے گارے کا نام (آژَند) ہے   ہے (نصیحت) بھی وہی، جو (پَند) ہے

(پند) کو (اَندرز) بھی کہتے ہیں، ہاں   (اَرض) ہے، پر (مَرز) بھی کہتے ہیں ہاں

کیا ہے (اَرض) اور (مَرز)؟ تم سمجھے؟ (زمیں)   (عُنق) گردن، اور پیشانی (جبیں)

(آس) چکّی، (آسیا)، مشہور ہے   اور (فوفَل) چھالیا مشہور ہے

بانسلی (نَے) اور (جَلاجل) جھانجھ ہے   پھر (سَتَروَن) اور (عَقیمہ) بانجھ ہے

(کُحل) سُرمہ، اور سلائی (مِیل) ہے   جس کو جھولی کہیے وہ (زَنبیل) ہے

پایا قادر نامے نے آج اختتام   اک غزل تم اور پڑھ لو، والسلام!

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں   مانتا، لیکن ہمارا دل، نہیں

علم سے ہی قدر ہے انسان کی   ہے وہی انساں، جو جاہل نہیں

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار؟   آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں

کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟   ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء

مُتفرّق

تیسرا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۱ء

چوتھا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۶۲ء

(پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) کے تمام اشعار چوتھے مطبوعہ ایڈیشن تک شاملِ دیوان ہوکر شائع ہو چکے تھے)

○ ...۱۸۵۷ء

قطعہ

بس کہ فعّالِ مایُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا[1]
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ، ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر، بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی، واں نہ جاسکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے، یارب!
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا؟

○ ...بعد از ۱۸۵۷ء

قطعہ

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل — تجھے ہے جوگ مایا اور دیبی[2]
نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا — مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

---

[1] "یہ قطعہ اردوے معلیٰ: ۱۰ اء میں علائی کے نام کے ایک خط کے ساتھ بغیر کسی حوالے کے چھپا ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ہے"
[2] تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۴۷

○ ...بعد از ۱۸۵۷ء

غزل

آپ نے "مسّنی الضُر" کہا ہے تو سہی — یہ بھی، یا حضرتِ ایّوب! گِلا ہے تو سہی[1]
رنج، طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر؟ — ذہن میں، خوبیِ تسلیم و رضا، ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بامیّد گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا، ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری — نہ سہی، لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نباہی اُس نے — نہ سہی ہم سے، پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں، مَیں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ؟
شُہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

○ ...قبل از ۸ فروری ۱۸۵۸ء

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدیں خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہ کشاں ہے سہرا[2]
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

[1، 2] تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر' ص ۶۵

○ ...۱۸۵۸ء

قصیدہ

مَلاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ جنابِ عالی ایلن برِون والا جاہ[1]
بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر کہ، باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ
وہ محضِ رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرّہ کاہ
زمیں سے سُودۂ گوہر اُٹھے، بجائے غبار جہاں ہو، توسنِ حشمت کا اس کے جولاں گاہ
وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں: "الٰہی شکر!" وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے: "خدا کی پناہ"
یہ اس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش ق کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہرِ سرِ راہ
ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا کبھی جو، ہوتی ہے اُلجھی ہوئی، دُمِ روباہ
نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ
خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
زہے! ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے شُعاعِ مہرِ درخشاں ہو، اُس کا تارِ نگاہ

---

[1] "یہ قصیدہ میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کی طرف سے مسٹر ایلن برِون کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد میں لکھا تھا۔ چنانچہ منشی جی کو خط میں لکھتے ہیں:
"کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست، خصوصاً میرزا تفتہ، جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روشِ خاص سے سنہ ۱۸۵۸ء کا اظہار کر دیا ہے۔ خدا کرے، تمھارے پسند آوے۔ تم خود قدردانِ سخن ہو۔ اور تین استاد اس فن کے تمھارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔" (اردوے معلیٰ ص ۲۵۰)۔" نسخۂ عرشی، ص ۴۷۶

○ ...۱۸۵۸ء

خدا سے ہے یہ توقّع کہ عہدِ طفلی میں بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ
جوان ہو کے کرے گا، یہ، وہ جہانبانی کہ تابع اس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ
کہے گی خلق اسے: "داورِ سپہر شکوہ" لکھیں گے لوگ اسے: "خسروِ ستارہ سپاہ"
عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے روانِ روشن و خوے خوش و دلِ آگاہ
ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ
یہ تُرکتاز سے برہم کرے گا کشورِ رُوس یہ لے گا، بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں، سب ہزار ہو جاویں دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
امیدوارِ عنایات، شیو نراین کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا، اللہ!

غزل

...۱۸۵۸ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ م غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟[1]

---

[1] خط بنام مرزا حاتم علی مہرؔ۔ محرّرہ اوائل جولائی ۱۸۵۸ء میں صرف مطلع اور مقطع درج ہے۔ مطلع ثانی بھی یقیناً ۱۸۶۲ء سے پہلے کہہ لیا گیا ہوگا جبھی تو یہ تینوں شعر نسخۂ رامپور میں شامل ہو سکے۔ مگر بقیہ چار شعر وہ ہیں جو غالبؔ نے اپنے خط بنامِ علائیؔ محرّرہ اواخر دسمبر ۱۸۶۵ء میں علائیؔ کی فرمائش پر تازہ کہہ کر بھیجے تھے۔ اس طرح یہ غزل کا عہدِ فکر ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک قرار پاتا ہے۔

○ ...۱۸۵۸ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء

تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے م رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملّت کا خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟
وہ دادودید گراں مایہ شرط ہے ہمدم وگرنہ، مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟
کٹے تو شب کہیں کاٹے، تو سانپ کہلاوے کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے؟
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود کسے خبر ہے کہ واں جُنبشِ قلم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی م یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے؟

○ ...قبل از ۱۸۶۰ء مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر، شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں، چشمِ ملائک سے رواں ہو[1]
اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو؟
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو

---

[1] سرورِ ریاض ص ۲۳ تا ۲۷۔ از ریاض الدین امجد سندیلوی) ریاض تخلص۔ یہ بند خود غالبؔ نے "اپنے دستِ خاص سے لکھ کر" ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کو امجد سندیلوی کو دیے تھے۔ تاہم کلام یقیناً پہلے کا کہا ہوا ہے۔ اگر حالیؔ کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مرثیہ مجتہد العصر سید محمد کی فرمایش پر کہنا شروع کیا تھا تو یقیناً مرثیہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا فکر کردہ ہوگا۔ کیونکہ ہنگامے کے بعد تو بقول صاحب بزمِ غالبؔ خود مجتہد العصر کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں، غالبؔ نے مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ سے ان کی خیریت دریافت کی ہے اس کے بعد بھی عرصے تک حالات ایسی فرمایشوں کے لیے سازگار کہاں رہے ہوں گے

○ ...قبل از ۱۸۶۰ء

گھر پھونکنے میں اپنے، مُحابا نہیں ہم کو گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ نحرگہِ نہ پایۂ جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبّیر سے لپٹے میں سوا ہے؟

کچھ اور ہی عالم ہے، دل و چشم و زباں کا کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے، جہاں کا
کیسا فلک؟ اور مہرِ جہانتاب کہاں کا ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

...۱۸۶۰ء قطعہ

جب کہ سیّد غلام بابا نے مسندِ عیش پر جگہ پائی[1]
ایسی رونق ہوئی برات کی رات کہ کواکب ہوے تماشائی

قطعہ

ہزار شکر کہ سیّد غلام بابا نے فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی[2]
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

---

[1] خط بنام سیّاح۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء (یہ وہی خط ہے جس میں غالبؔ نے کہا ہے کہ انھیں فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے لگاؤ نہیں۔ اور کہ ان کی دونوں تاریخوں میں "مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار ان کے ہیں۔ پھر کہتے ہیں "وہ دوست جو مادّہ ڈھونڈھ دیتے تھے' وہ جنّت کو سدھارے"

[2] خط بنام سیّاح۔ ۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء

○ ...۱۸۶۰/۶۱ء

قطعہ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب　　آب و تابِ انطباع کی پائی[1]
فکرِ تاریخ سال میں، مجھ کو　　ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو　　دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا　　با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم　　بے شمولِ عبارت آرائی
مگر، اب ذوقِ بذلہ سنجی کو　　ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ　　یہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم　　جس سے ہے چشمِ جاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں، بارہ　　جس سے ایماں کو ہے توانائی
اُن کو، غالبؔ، یہ سال اچھا ہے
جو ائمّہ کے ہیں تولّائی

قطعہ

...۱۸۶۲ء

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں　　حکیمِ حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام[2]
تمام دہر میں اُس کے مطب کا چرچا ہے　　کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

---

[1] تذکرہ سراپا سخن طبعِ اوّل از محسن علی محسنؔ لکھنوی۔ ص ۳۹۳۔ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰/۶۱ء)
[2] 'تکشیفِ حکمت' از حکیم محمد سلیم خاں دہلوی۔ مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۸۸

○ ...۱۸۶۲ء

اسے فضائلِ علم و ہنر کی افزایش　　ہوئی ہے، مُبدعِ عالم سے، اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اُس کے　　ہزار بار فلاطوں کو دے چکے اِلزام
عجیب نسخۂ نادر، لکھا ہے ایک اُس نے　　کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع　　نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اُس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے　　کمالِ فکر میں دیکھا، خرد نے، بے آرام
کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے؟　　"لکھا ہے نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام

(۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء)

غزل

...۱۸۶۲ء (مج)

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز؟　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

---

[1] یہ غزل مب میں نہیں ہے اس لیے اسے مج کے حوالے سے ۱۸۶۲ء ہی کا قرار دے دیا ہے

○ ... ۱۸۶۲ء

رُباعیات

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ؟ ثاقبؔ، حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے[۱]

اے روشنیِ دیدہ شہاب الدیں خاں کٹتا ہے، بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک ؟ سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں[۲] ؟

۱،۲ عرشی مرحوم فرماتے ہیں،
"یہ دونوں رباعیاں گویا دو منظوم خط ہیں جو مرزا صاحب نے نواب شہاب الدین خاں بہادر ثاقبؔ کو لکھے تھے۔ مولوی مہیش پرشاد مرتبِ خطوطِ غالبؔ کی رائے میں: ۱۸۶۲ء کے بعد کی معلوم ہوتی ہیں"۔ میری رائے میں یہ تفریحی رقعے ہیں جو شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے عنفوانِ شباب ہی میں لکھے گئے ہونگے۔ وہ نہ صرف اس وقت غیر شادی شدہ ہونگے بلکہ ۱۶-۱۷ سے زیادہ عمر کے نہ ہوں گے۔ بہر حال منشی مہیش پرشاد کے تتبع میں ان رباعیوں کو ۱۸۶۲ء میں رکھ لیا گیا ہے مگر یہ سال قطعی قیاسی ہے

۱۸۶۲ء
تا
۱۸۶۷ء

مُتفرِّقات

○ ...۱۸۶۳ء

قصیدہ

گِنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ[1]

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بروزِ شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار، گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو تاگا ہے
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ بڑھے؟
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ، کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ "دیکھ کتنی، اٹھا لائے گا یہ تار، گرہ؟"

کہا کہ "چرخ پہ ہم نے گِنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گِنیں گے، تو پاویں گے نو ہزار گرہ"

خود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں اُس تار پر نثار، گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی الفور، دانہ وار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نوبہار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار، گرہ

---

[1] یہ قصیدہ مہاراؤ راجہ شیودان سنگھ والیِ الور کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مصرعِ اوّل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی ۲۰ ویں سالگرہ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ وہ راجہ بنے سنگھ کے (۱۸۵۷ء میں) مرنے پر ۱۳ برس کی عمر میں) اگست ۱۸۵۷ء میں مسند نشین ہوئے تھے مگر ناتجربہ کاری کی بنا پر اُنھیں نومبر ۱۸۵۸ء میں اختیارات سے بے دخل کر دیا گیا اور پانچ سال بعد ۱۴ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دوبارہ با اختیار کیا گیا (بحوالہ وقائع راجستان ص ۴/۷، ۳/۳،۴) راجا شیودان سنگھ کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں مگر "بیس بار گرہ" سے ظاہر ہے کہ اختیارات عمر کے بیس سال پورے کرنے پر بحال کیے گئے ہوں گے۔ اس طرح ولادت کے ماہ و سال دسمبر ۱۸۴۳ء ٹھہرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ بھی ۱۴ ہی ہو یعنی ۱۴ دسمبر ۱۸۴۳ء

قصیدہ پہلے پہل رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں شایع ہوا تھا

○ ...۱۸۶۳ء

اُنھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں، گہر ہائے شاہوار، گرہ

اُنھیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار، گرہ

سن اے ندیم، برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ؟

پئے دعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی، اس میں، ثوابت کی استوار گرہ

ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے
بلا مبالغہ، درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے وہ جاذبہ اُس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتہ زینہار گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں کہ اس زمانے میں
بچی نہ، از پئے بندِ نقابِ یار، گرہ

متاعِ عیش کا ہے، قافلہ چلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ

خدا نے دی ہے وہ غالبؔ کو دستگاہِ سخن
کروڑوں ڈھونڈھ کے لاتا یہ خاکسار گرہ

کہاں مجالِ سخن؟ سانس لے نہیں سکتا
پڑی ہے، غم کی، مرے دل میں پیچ دار گرہ

گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
زباں تک آ کے، ہوئی اور استوار گرہ

کُھلے یہ گانٹھ، تو البتہ دم نکل جاوے
بُری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار گرہ

ادھر نہ ہو گی، توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلے گی نہ، زینہار گرہ

دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں از رہِ بغض
پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

دل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بہ شکلِ پھوڑے کے
خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھار گرہ

○ ... ۱۸۶۴ء

مثنوی

اے جہاں آفریں خداے کریم   صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم[1]
نام مکلوڈ جن کا ہے مشہور   یہ ہمیشہ بہ صد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادماں ہیں   اور غالب پہ مہرباں ہیں

شعر

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے؟
روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گیا[2]

رباعی

اے منشیِ خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو   عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو[3]
آواز نزی نکلے اور آواز کے ساتھ   لاٹھی وہ لگے کہ جس میں آواز نہ ہو

---

۱ یہ مثنوی میرزا غالب کے مرتبہ اُس بے نام اردو کتابچے (اب میں نے اس کا عکس مع مقدمہ "انتخاب رقعات و اشعار غالب" کے نام سے چھپوا دیا ہے) کے دیباچے کے آخر میں ملتی ہے، جو شاید انھوں نے ہندوستان میں مقیم انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے اپنے منتخب رقعات اور اشعار پر مشتمل ترتیب دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے میکلوڈ صاحب "فنانشل کمشنر بہادر قلمرو پنجاب" کی نذر کیا ہے۔
"(مسٹر ڈانلڈ) مکلوڈ نے سر رابرٹ منٹگمری کے ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو مستعفی ہونے کے بعد پنجاب کی لفٹیننٹ گورنری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ظاہر ہے کہ فنانشل کمشنر وہ اس سے پہلے ہی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۴ء کی مرتبہ تسلیم کرنا چاہیے۔" (انتخابِ رقعات و اشعارِ غالب ص دس)
۲ خط بنام بے خبر مورخہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء
۳ لطائفِ غیبی مطبوعہ ۱۸۶۴ء ص ۱۵

○ ... ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں   عیدِ شوّال و ماہِ فرور دیں[1]
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار   مہ و سال، اشرفِ شہور و سنین
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز   لیک، بیش از سہ ہفتہ بُعد نہیں
سو، اس اکیس دن میں ہولی کی   مجلسیں، جا بجا، ہوئیں رنگیں
شہر میں، کُو بہ کُو، عبیر و گلال   باغ میں سُو بہ سُو، گل و نسریں
شہر، گویا، نمونۂ گلزار   باغ، گویا، نگارخانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب   جمع ہرگز ہوے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں   منعقد، محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب   رونق افزاے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں، امیر شاہ نشاں   رزم گہ میں، حریفِ شیر کمیں
پیش گاہِ حضور، شوکت و جاہ   خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
جن کی مسند کا، آسماں، گوشہ   جن کی خاتم کا، آفتاب، نگیں

---

۱ خط بنام منشی سیل چند" مورخہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۵ء سے پتا چلتا ہے کہ یہ قصیدہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔" یہ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے جشنِ صحت کے موقع پہ کہا گیا تھا

○ ...۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں، ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو، کبھی بروئے زمیں
انجم چرخ، گوہر آگیں فرش — نور کے، ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اِندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ، ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا، بچھے ہیں، دُرِّ ثمیں
نغمۂ مُطربانِ زُہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنوں — یاں، وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار — ق بجمالِ تجمّل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — اور بالِ پری ہے، دامنِ زیں
نقشِ سُمِّ سمند سے، یکسر — بن گیا، دشت، دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مُشک فشاں — رہروؤں کے مشامِ عطر آگیں
بس کہ بخشی ہے فوج کو عزّت — فوج کا ہر پیادہ، ہے فرزیں
موکبِ خاص، یوں زمیں پر تھا — جس طرح ہے سپہر پر، پرویں
چھوڑ دیتا تھا گورکو، بہرام — ق ران پر داغِ تازہ دے کے، وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا — خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور ثنا طرازی سے — مدّعا، عرضِ فنِ شعر نہیں

○ ...۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۸ جنوری ۱۸۶۵ء

آپ کی مدح اور میرا مُنھ — گر کہوں بھی، تو کس کو آئے یقیں
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے — ہوگیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ! — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صِرف، اظہار ہے، ارادت کا — ہے قلم کی، جو سجدہ ریز، جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے — غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دُنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں، آمیں!

...قبل از ۱۸۶۵ء **شعر**

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

...۱۸۶۵ء **قطعہ**

مُقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطّۂ خاک — رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس[1]
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر — "بیار" لائیے گلنار گوں، "بیادہ" برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درِ حضور پر اے ابر، باربار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک، وہ کہے — "امیر کلبِ علی خاں جییں ہزار برس"[2]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر" ص ۶۵
[2] یہ قطعہ خط بنام نواب کلبِ علی خاں، مورخہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کے ساتھ بھیجا گیا تھا

○ ... ۱۸۶۵ء

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں　　کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس

جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے　　بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالبؔ کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

غزلیات

... ۱۸۶۵ء

لطفِ نظّارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے　　جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے[1]

اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری؟　　دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ　　ساتھ حُجّاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں　　لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خونبار ہے مدّت سے، ولے آج ندیم　　دل کے ٹکڑے بھی کئی، خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں　　عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے

موت بس ان کی ہے جو مر کے وہیں دفن ہوئے　　زیست اُن کی ہے جو اُس کوچے سے گھائل آئے

بن گیا سُبحہ وہ زُنّار، خدا خیر کرے!　　وہ جو نازک ہے کمر اُس پہ بہت دل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مِل آئے

---

[1] "یہ غزل میرزا صاحب نے اپنے دوسرے سفر رام پور میں ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کہی تھی۔ اس زمانے میں کلبِ علی خاں بہادر رام پور کے نواب تھے۔" (نسخۂ عرشی طبع دوم ص ۴۳۳)

○ ... ۱۸۶۵ء

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی　　تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی[1]

غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ؟　　ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟　　تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی　　آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا　　کعبہ اِک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ؟　　خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب؟　　سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں　　زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے، غالبؔ، یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

قطعہ

○ ... ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے　　پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں[2]

سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم　　کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

---

[1] خط بنام نواب امین الدین احمد خاں مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۸۶۵ء

[2] یہ قطعہ نواب علائی کی بیاض سے لیا گیا ہے۔ "بیاض کے اندراجات میں ترتیب تاریخی کا لحاظ نہیں ہے، چنانچہ ان سے پہلے ۲۷ر جنوری ۱۸۶۷ء کا اور ان کے بعد ۵ اپریل ۱۸۶۵ء کا اندراج ملتا ہے۔ اس لیے انہیں تقریباً اسی زمانے کا مان لیا ہے۔"

○ ... ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء

سوا ناج کے، جو ہے مقلوبِ جاں / نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں / ابھی جا کے پوچھو کہ "کل کیا پکائیں؟"
وہ کھٹے، کہاں پائیں املی کے پھول / وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو اُس کو کیا، کھا کے ہم حظ اٹھائیں؟

غزلیات

... ۱۸۶۶ء

در پہ امیرِ کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم / ق شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں[1]
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسد / خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

... ۱۸۶۶ء

مسجد کے زیرِ سایہ، اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے[2]

---

۱ میرزا صاحب نے اس زمین میں اپنی (برسوں پرانی) غزل .... کا مقطع حذف کر کے اور آخر میں یہ دو شعر بڑھا کر، نواب کلبِ علی خاں بہادر والیِ رامپور کی خدمت میں ۹ جون ۱۸۶۶ء کو بھیجی تھی۔

۲ "یہ شعر میرزا صاحب نے اپنے مکان واقع محلہ بلّی ماران کے متعلق کہا تھا۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق یہ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا، اور اسی میں اُن کا انتقال ہوا تھا (یادگار: ۸)۔ مولانا مہر کی رائے ہے کہ اس میں میرزا صاحب جنوری ۱۸۶۶ء کے بعد منتقل ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو غالب: ۸۵ (طبعِ سوم)۔" نسخۂ عرشی اشاعتِ دوم ص ۴۳۶

○ ... ۱۸۶۷ء

قطعہ

گڑگانویں کی ہے جتنی رعیّت وہ یک قلم / عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی[1]
سو یہ، نظر فروز قلم دان نذر ہے / مسٹر کوآن صاحبِ عالی مقام کی

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے / جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور[2]
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے / اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصلِ تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے / پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دُور دُور

غزلیات

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بَن تکیہ / ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ[3]
خراج بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟ / کہ بن گیا ہے، خمِ جعدِ پُر شکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں، بستر / ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام / جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ

---

۱ مسٹر جے ایل، کوآن اسسٹنٹ کمشنر گڑگانواں۔ فروری ۱۸۶۶ء میں دہلی سوسائٹی کے ممبر بنائے گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۰، ۸۱۔ قطعہ کوآن صاحب کی ٹرانسفر کے موقع پر کہا گیا تھا۔

۲ رسالۂ دہلی سوسائٹی، شمارہ تیسرا۔ احوالِ غالب، ص ۱۷۲ تا ۱۹۲

۳ پہلے پہل گلدستۂ انجمن مطبوعہ مطبع اکبری دہلی، ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں چھپی (مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لاہور)۔ بعد میں نواب احمد سعید خاں طالب شاگردِ غالب نے اپنے کاغذات سے فراہم کر کے ۴ جون ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں چھپوائی۔

○ ... ۱۸۶۷ء

مزا ملے، کہو، کیا خاک ساتھ سونے کا؟ — رکھے جو بیچ میں، وہ شوخِ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر! — اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ
ہوا ہے، کاٹ کے چادر کو، ناگہاں غائب — اگرچہ زانوئے نَل پر رکھے، دَمن، تکیہ
بضربِ تیشہ وہ! اس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک — رکھو نہ شمع پہ، اے اہلِ انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن — اُٹھائے کیونکے، یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آگیا جو، پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی ہے اُس کو مری لاشِ بے کفن تکیہ
جو بعدِ قتل مرا دشت میں مزار بنا — لگا کے بیٹھتے ہیں اُس سے راہ زن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیّت کا — کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے مَن تکیہ
روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظِ "تکیہ کلام" — اب اُس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سُخن تکیہ"

ہم اور تم، فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشتِ غم میں آہوئے صیّاد دیدہ ہوں[1]
ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

۱ خط بنام نواب علائی مورخہ ۳؍مارچ ۱۸۶۷ء

○ ... ۱۸۶۷ء

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں
نے سُبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ — میں مَعرضِ مثال میں، دستِ بُریدہ ہوں
ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ — نَے دانۂ فتادہ ہوں، نَے دامِ چیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ، مری قدر و منزلت — میں یوسفِ بقیمتِ اوّل (؟)، خریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ — ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ وَرَع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زمرے میں، مَیں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح، اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

قصیدہ

کرتا ہے چرخ[1]، روز بصد گونہ احترام — فرمانروائے کشورِ پنجاب کو، سلام[2]
حق گوے و حق پرست و حق اندیش و حق شناس — نوّابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جَم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم — ترکِ فلک کے ہاتھ سے، وہ چھین لیں حُسام
جس بزم میں کہ ہو انھیں آہنگِ میکشی — واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام

۱ یہ قصیدہ سب سے پہلے ۱؍جون ۱۹۱۴ء کے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے شائع کیا تھا۔ مولانا نے اسے نواب سعید الدین احمد خاں طالب کے نسخۂ دیوانِ غالب سے حاصل کیا تھا

۲ سر ڈانلڈ میکلوڈ ۱۰؍جنوری ۱۸۶۵ء کو منٹگمری صاحب کے مستعفی ہونے پر پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے تھے

○ ...۱۸۶۷ء

چاہا تھا میں نے، تم کو مہِ چاردہ کہوں ق دل نے کہا کہ "یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام"
دو رات میں تمام ہے، ہنگامہ ماہ کا حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدّوام
سچ ہے تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے دریائے نور ہے، فلکِ آبگینہ فام
میری سنو، کہ آج تم اِس سرزمین پر حق کے تفضّلات سے، ہو مرجعِ انام
اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو، جگر کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستّر[1] برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی[2] جنوری مہینے کی تاریخ، تیرھویں اِستادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اُس بزمِ پُرفروغ میں، اِس تیرہ بخت کو نمبر ملا نشیب میں، از روئے اہتمام
سمجھا اُسے گر آپ، ہوا پاش پاش، دل دربار میں جو مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام

[1] اس شعر سے ظاہر ہے کہ مرزا نے جب یہ شعر کہا تو وہ ستر برس کے ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس کلام کو ۱۸۶۷ء کا کہا ہوا تسلیم کرنا چاہیے
[2] لبِ دریا (جمنا کنارے) ۱۳ جنوری کو ریل (ریل پر سے) جاری ہونے کے جشن کے لیے خیمے لگ گئے۔ بقول مولانا عرشی پُل پر سے ریل پہلی بار یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ جشن افتتاح ۱۳ جنوری کو منایا گیا ہو۔ چونکہ قصیدے میں غالب کو مناسب مقام و مرتبہ نہ ملنے کی شکایت ہے اس لیے ظاہر ہے کہ قصیدہ ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کے بعد ہی کہا گیا ہوگا

○ ...۱۸۶۷ء

عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے، بِنا عزّت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام
تھا ایک گونہ ناز، جو اپنے کمال پر اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے انتقام
آیا تھا، وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
اس کشمکش میں آپ کا مدّاحِ دردمند آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
جو واں نہ کہہ سکا، وہ لکھا ہے حضور کو دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام
ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں سلطانِ بَرّ و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریا کا، دہر میں جو، مدح خواں ہو شاہانِ عصر چاہیے، لیں عزت اُس سے وام
خود ہے تدارک اس کا، گورمنٹ کو ضرور بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالب ہے جس کا نام
امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے، قیام
ہے بندے کو اعادۂ عزّت کی آرزو چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام
دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے یعنی، دعا پہ مدح کا، کرتے ہیں اختتام
ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے اِقلیمِ ہند و سِند سے تا ملکِ روم و شام!

[1] لبِ دریا (جمنا کنارے) ۱۳ جنوری کو ریل (پُل پر سے) جاری ہونے کے جشن کے لیے خیمے لگ گئے۔ بقول مولانا عرشی پُل پر سے ریل پہلی بار یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ جشن افتتاح ۱۳ جنوری کو منایا گیا ہو۔ چونکہ قصیدے میں غالب کو مناسب مقام و مرتبہ نہ ملنے کی شکایت ہے اس لیے ظاہر ہے کہ قصیدہ (جو در حقیقت شکایت نامہ ہے) ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کے بعد ہی کہا گیا ہوگا

○ ... اکتوبر/ نومبر ۱۸۶۷ء

قطعہ

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں ۔۔۔ حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر ۔۔۔ کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ ۔۔۔ اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں؛ جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بُقعۂ معمور کہ ہے ۔۔۔ مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال ۔۔۔ دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں ۔۔۔ ہے اسی طور پہ یاں دجلہ‌فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام ۔۔۔ دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آ جائے جسے ہو نہ یقیں ۔۔۔ سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا! باغِ ہمایونِ تقدّس آثار ۔۔۔ کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں، راہرو و راہ شناس ۔۔۔ خضر بھی یاں اگر آ جائے، تو لے اُن کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سُخن ۔۔۔ اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اِغراق، رقم
حق سے کیا مانگیے؟ ان کے لیے جب ہو موجود ۔۔۔ ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کُوس و عَلَم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غُلو کے قائل ۔۔۔ دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نوّاب کو ہم
یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے ۔۔۔ دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا، عالم
اولاً، عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال ۔۔۔ ثانیاً، دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم[1]

[1] یہ قطعہ مکتوب غالب بنام نواب کلب علی خاں بہادر مورخہ ۵ رجب ۱۲۸۴ھ (۳ نومبر ۱۸۶۷ء) کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ (مرزا غالب کا یہ آخری کلام ہے جو تا حال دریافت ہوا ہے

○ ... بعد از ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

شعر

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے ۔۔۔ عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے[1]

[1] (ا) آبِ حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر (دمِ واپسیں الخ) کہا تھا"

(ب) یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں:

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہو گا، اُس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا: دمِ واپسیں الخ"

(ج) مرقعِ ادب مرتبہ صفدر مرزاپوری کے ص ۱۹ پر غالب کا ایک خط بنام مولانا احمد حسین میناؔ مرزاپوری، مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء درج ہے۔ اس میں مرزا لکھتے ہیں۔

"مولوی فرزند علی صاحب اخگرؔ کا کون شخص مشتاق نہ ہو گا۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فقیر تو ان سے مل کر بہت خوش ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (وہ) جب چاہیں اپنا کلام (برائے اصلاح) بھیج دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

معلوم ہوتا ہے چند ہی دنوں بعد، میناؔ مرزاپوری کے خط کے ساتھ ہی جناب اخگرؔ کا خط مع غزل پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں، اصلاح شدہ غزل واپس کرتے ہوئے مرزا نے یہ بھی لکھا

"قبلۂ حاجات، میرا حال کیا پوچھتے ہیں۔ زندہ ہوں مگر مُردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما گئے تھے۔ اب اس سے بھی بدتر ہے۔ مرزاپور کیا آؤں اب سوائے سفرِ آخرت اور کسی سفر کی نہ مجھ میں طاقت ہے نہ جرأت۔ جوان ہوتا تو احباب سے

○ ... بعد از ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

دعاے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں، تو دعاے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے۔ عزیز ذات اللہ ہی اللہ ہے"۔

اس خط سے ثابت ہے کہ اگر اس شعر کو مرزا کی بدیہہ گوئی پر محمول سمجھ لیا جاے اور فرض کر لیا جائے کہ جواب لکھتے وقت یہ شعر بھی قلم سے نکل گیا ہوگا، تو بھی شاید یہ آخرِ اگست ۱۸۶۷ء کے بعد کا فکر کردہ نہ ہوگا ـــــ واللہ اعلم